کھوئے ہوؤں کی جستجو

پروفیسر شہرت بخاری
اخذ و ترتیب: ذوالکفل بخاری

سوچتا ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میری پیدائش کسی ایسے جلسے یا مجلس میں ہوئی ہو گی جس میں کوئی سیاسی یا مذہبی رہنما یا عالم اپنی شعلہ بیانی سے سامعین کے دلوں میں بھٹیاں دہکا رہا ہو گا۔ اور وہ نعروں یا آہ و بکا سے زمین کا دل ہلا رہے ہوں گے۔ شاید ہی کوئی ایسی سیاسی یا مذہبی شخصیت ہو گی جس کی آواز سے میرے کان مانوس نہ ہوں۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ مگر کسی ہندو لیڈر کی ایسی تقریر میں اب تک نہ سن سکا تھا جس نے جلسے کے بعد چند منٹ کے لئے بھی اپنی گونج میرے دماغ میں چھوڑی ہے۔ ان میں گاندھی بھی تھے، پنڈت جواہر لال نہرو بھی۔ اسی لئے ابا عموماً ایسے جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے جن میں یا تو صرف ہندو مقرر ہوتے یا کوئی ٹکسال باہر مسلمان خطیب۔ یہی کیفیت میری ہو گئی تھی۔ میرے نزدیک اچھا مقرر تو گھنٹوں بولتا تھا۔ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری تو فجر کی اذان سے مجبور ہو کر اکثر ذوق کے اس شعر پر بولنا بند کرتے تھے۔

مؤذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

ابا کو سیاست سے دلچسپی تھی مگر صرف حسن خطابت تک۔ جو سیاسی یا مذہبی رہنما اچھا خطیب ہوتا تھا وہ ابا کا ہیرو ہوتا تھا۔ انہیں ان کے سیاسی نظریات اور مذہبی معتقدات سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان کے نام بڑی محبت سے لیتے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے تو عاشق تھے۔ شاہ جی کی تقریر عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوتی تھی اور فجر کی اذان کے ساتھ ختم ہوتی تھی۔ ابا رات بھر بیٹھے رہتے تھے شاہ جی تلاوت کلام پاک بے مثال خوش الحانی سے کرتے تھے۔ ابا نہایت خشوع و خضوع سے سنتے اور زار و قطار روتے تھے۔

لاہور میں ایبک روڈ پر ایک ہندو تاجر کتب تھا۔ راج پال اس کا نام تھا۔ اسکے نام سے یا خود اس نے ایک کتاب لکھ کر شائع کی جس کا نام نعوذ باللہ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ "رنگیلا رسول" تھا۔ میں نے یہ کتاب دیکھی نہیں مگر سنا ہے کہ اس میں حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم (میرے ماں باپ اور میری اولاد ان کے اسم گرامی پر قربان ہوں) کی ذات مطہر پر شدید قسم کے حملے کئے گئے۔ پورے ملک میں بے اطمینانی اور غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ لاہور کے مسلمانوں کو اس مکروہ کتاب کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر محسوس ہو رہی تھی۔ ان پر نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ عورتیں مرد بچے بوڑھے سب کے سب خود کو زندگی کے سب سے بڑے عذاب میں گھرا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو شدید بے بسی میں پا رہے تھے۔ ایک قیامت تھی کہ لاہور کے مسلمانوں کے سروں پر ٹوٹی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی جماعتیں بڑے

بڑے جلسے کر رہی تھیں۔ جلوس نکال رہی تھیں۔ مگر سب بے اثر ---------- مسلمانوں کا اضطراب بڑھتا جارہا تھا کوئی حل سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ایک رات دلی دروازے کے باغ میں بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ کہا جاتا ہے سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی زندگی کی سب سے مؤثر تقریر کی۔ عشاء کی نماز سے فجر کی اذان تک ہزاروں کا مجمع جذباتی اعتبار سے رفتہ رفتہ اس مقام پر آچکا تھا کہ انہیں اپنی زندگیاں حرام معلوم ہونے لگیں۔ شاید ہی کوئی گھر ہوگا جس تک اس تقریر کا اثر نہ پہنچا ہو۔ جو جلسے میں موجود نہیں تھے وہ بھی اپنے اپنے گھروں میں انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ شاہ جی کے الفاظ نے مسلمانوں کو بے ساختہ گریہ و بکا پر مجبور کر دیا۔

ابھی دن کا ایک پہر ہی گزرا تھا کہ یہ خبر شہر کے گلی کوچوں میں گھر گھر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ بازار سریاں والا (اس محلے کا اصل نام بازار سر فروشاں ہے مگر عرف عام میں سریاں والا ہی مشہور ہے) کے ایک ان پڑھے نجار زادے نے اس ملعون کو کیفر کردار کو پہنچا دیا جس نے ملت اسلامیہ کو اتنی اذیت پہنچائی تھی کہ اس کی مثال اس شہر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

یہ علم الدین تھا ---------- اچانک وہ "غازی علم الدین" ہو گیا---------- شاہ جی کے جلسے سے اٹھ کر اس نے کسی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی اور سیدھا ایبک روڈ پہنچا جیب سے بڑا سا چاقو نکالا اور لالہ راج پال کے دل میں ترازو کر دیا۔ پھر بڑے سکون سے دکان سے نکلا اور لوہاری دروازے کے تھانے میں گیا اور مقدمہ درج کرا دیا اسے گرفتار کر لیا گیا بڑے بڑے وکیل مقدمہ لڑنے کو جمع ہوئے قائد اعظم بمبئی سے تشریف لائے۔ سنا ہے قائد اعظم اُسے جیل میں ملے اور اصرار کیا کہ "صرف ایک بار عدالت میں کہہ دو کہ میں نے قتل نہیں کیا پھر میرا کام ہے اور میں دیکھوں گا کہ کیسے تمہیں سزا دی جاتی ہے" مگر اس غازی نے جو پراسرار بندوں میں شمار ہوتا تھا صاف صاف کہہ دیا "میں اس سے انکار نہیں کروں گا------- میری زندگی کی یہی تو ایک کمائی ہے۔ میں اسے کسی قیمت پر ضائع نہیں کروں گا"۔

غازی علم الدین "غازی علم الدین شہید" بن گیا۔ ایسا فقید المثال جنازہ لاہور کے بازاروں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ پہلا جلوس تھا جس میں ابا نے شمولیت کی تھی۔

دہلی دروازے کے باہر ایک مسجد ہے۔ مسلمان اسے "مسجد شہید گنج" کہتے ہیں اور سکھ "گوردوارہ شہید گنج" ۱۹۳۵ء میں اچانک سکھوں نے اسے مسمار کر کے گوردوارہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس خبر نے لاہور کے مسلمانوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ پہلے گلی محلوں میں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ پھر باقاعدہ احتجاجی جلسے منعقد ہونے لگے---- ہوتے رہے ہوتے رہے۔ قرار دادیں منظور ہوتی رہی۔ ادھر ایک صبح اس خبر نے لاہور میں آگ لگا دی کہ "مسجد کو شہید کر دیا گیا"۔ مسلمان بپھرے ہوئے شیروں کی طرح گھروں سے نکل آئے۔ دکانیں بند ہو گئیں۔ سکھوں اور مسلمانوں میں کھچاؤ پیدا ہو گیا۔ سیاسی رہنماؤں کو ایک اور موقعہ ہاتھ لگا تاکہ وہ اپنا کاروبار چمکا سکیں------ مولانا ظفر علی خان اس موقع پر آخری مرتبہ اپنی سیاسی زندگی کے عروج پر آگئے۔ مولانا بڑے جوشیلے مقرر تھے ان کی تقریروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا---- ایک جمعہ کو

ایک عظیم جلوس بادشاہی مسجد سے نکلا اور غیض و غضب کی حالت میں شہید گنج کی طرف روانہ ہوا۔ دہلی دروازہ کے باہر گورا فوج صف باندھے کھڑی تھی۔ سر کلر روڈ کے چوک میں کوتوالی کے سامنے خاردار تاروں کی باڑھ لگا دی گئی تھی۔ ہزاروں کا جلوس وہاں آکر رک گیا۔ چند جاں بازوں نے تاریں ایک طرف ہٹا دیں اور نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ فوج اس صورتحال کی منتظر تھی۔ یک لخت گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ بے شمار

مسلمان پلک جھپکنے میں ڈھیر ہو گئے گولیاں برس رہی تھیں۔ لوگ گر رہے تھے مگر عجب تھا کہ پسپا ہونے والا کوئی نہ تھا۔ لوگ لاالہ الااللہ کہہ کہہ کر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خود کو شہادت کا حق دار ثابت کرنے کی کوشش میں ایک دوسرے پر سبقت لے جا رہے تھے۔

اس طرح بے دھڑک جان دینے کا منظر میں نے اس کے بعد بس ایک مرتبہ اور دیکھا (فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت گولی چلانے والے انگریزی فوجی سپاہی تھے اور اس وقت مسلمان اور آزاد مملکت پاکستان کے) سن ترپن (۱۹۵۳ء) میں جب لاہور میں قادیانیت کے خلاف تحریک چلی اور جنرل اعظم خان کا مارشل لاء نافذ ہوا تو ایک صبح انتظار حسین اور میں کافی ہاؤس چلے گئے۔ ہم اوپر گیلری میں جا بیٹھے۔ اور کھڑکی کے شیشوں سے باہر مال روڈ پر جھانکنے لگے۔ تھوڑی دیر میں چالیس پچاس نوعمر لڑکے نعرے لگاتے ہوئے پہنچ گئے۔ کافی ہاؤس کے سامنے فوج نے رکاوٹ کھڑی کی ہوئی تھی۔ یہ نوجوان وہاں پہنچے تو ان کے جوش و خروش میں کئی ہزار گنا اضافہ ہو گیا۔ فوج نے متنبہ کیا۔ جب کوئی اثر نہ ہوا اور جلوس فوج کے بالکل قریب آگیا۔ گولی چلانے کا حکم دیا گیا اور پلک جھپکتے میں نصف وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ایک لڑکا اگرچہ سب سے آگے تھا مگر اسے گولی نہ لگی وہ سخت بے قرار تھا۔ اور پوری قوت سے کلمہ پڑھ پڑھ کر سینہ ننگا کئے رکاوٹ کے اس طرف آگیا۔ ایک گولی نے اسے بھی ڈھیر کر دیا۔۔۔۔

شہید گنج کا واقعہ چند دن جاری رہا۔ شہر میں خاموشی چھا گئی۔ پھر جیسا کہ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ آپس میں لڑ پڑے اور ایک دوسرے کو سکھوں اور انگریزوں کے ہاتھوں بکنے کا طعنہ دینے لگے۔ جوش و خروش ٹھنڈا ہوتا چلا گیا اور یوں رفتہ رفتہ یہ خونیں تحریک دم توڑ گئی۔

یہ مسجد اب بھی قائم ہے۔ مگر شہید گنج کی مسجد کی خاطر جو جوان خون بے دریغ بہایا گیا میں اس کا عینی گواہ ہوں۔ اور ہر اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ برصغیر کی تحریکوں میں ایسا حادثہ کم ہی ہوا ہے۔ المیہ اس کا یہ ہے کہ اس کا ثمر بس اتنا ملا کہ سکھ اس جگہ گوردوارہ تعمیر نہ کر سکے صرف چار دیواری کھڑی کی گئی۔ جو اب بھی ہے۔ فرق ہے تو اتنا کہ ۱۴ اگست ۴۷ء تک پولیس کا سکھ سپاہی پہرا دیتا تھا اب مسلمان سپاہی اس کے دروازے پر پاسبانی کرتا ہے۔ بعض اوقات سیاسی مصلحتیں بھی کیسا کیسا دردناک منظر دکھاتی ہیں۔

سنا ہے لاہور میں مسجد کا ایک حادثہ اس سے پہلے بھی ہوا تھا وہی مسجد جو ایک رات میں تعمیر ہوئی تھی اور جس پر اقبال نے یہ شعر کہا تھا

مسجد تو بنا لی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اقبال جس کے نام کے ساتھ اہل لاہور کے دل دھڑکتے تھے اور میرا دل کہتا ہے بالکل یہی صورت حال پورے برصغیر کے مسلمانوں کی ہو گی۔ قوم پرست مسلمانوں میں شاید ایک مجلس احرار اسلام تھی جو نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود اقبال کی مخالفت نہ کرتی تھی اور یہ بات میں اس خیال سے بھی کہہ رہا ہوں کہ میں نے اکثر احرار کے جلسوں میں اقبال کے شعر سنے تھے۔

مسجد شہید گنج کے دردناک حادثے نے مجلس احرار اسلام کی کمر توڑ دی تھی حتیٰ کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری حسن خطابت و قرأت کلام پاک میں یکتائے روزگار ہونے کے باوجود اس کی ساکھ دوبارہ قائم کرنے میں ناکام ہوتے جا رہے تھے۔ اگرچہ شاہ جی کی تقریر سننے والوں سے دلی دروازے کا باغ اب بھی پر ہو جایا کرتا تھا مگر سامعین میں وہ جوش و خروش ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا جو شاہ جی کی تقریر سے مخصوص تھا خود انہیں اس بات کا احساس ہو چلا تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ایک رات انہوں نے اپنی تقریر کے اختتام کے قریب پہنچتے پہنچتے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا تھا مجھے معلوم ہے لاہور والو! تم جو یہاں جمع ہوئے تو صرف میری تقریر سے لطف حاصل کرنے کی غرض سے ورنہ دل تمہارے یہاں نہیں ہوتے۔۔۔۔ اس کے باوجود میں اس صورت حال سے بے نیاز ہوں اس لئے کہ سننے والا سن رہا ہے اور جاننے والا جانتا ہے کہ

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات انکی
انہیں کی محفل سجا رہا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی

معلوم نہیں یہ اس شعر کی تاثیر تھی جس کے خالق کا پتہ مجھے آج تک نہیں چل سکا یا شاہ جی کے احساس شکست کے اعتراف کا کرب تھا کہ کسی نے مجھے اندر سے جھنجھوڑ دیا۔ اور مجھے ایک سنگین دیوار میں رخنے پڑتے محسوس ہونے لگے۔ تقریر ختم ہوئی مگر میرے دل کی بہت سی کھڑکیاں کھل گئیں۔ آندھیاں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ میرے سینے میں سجی ہوئی ہر چیز فرش پر گر رہی تھی۔ پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ سورج غروب ہو رہا ہے جھٹ پٹا پھیلتا جا رہا ہے۔ اور میں جلسہ گاہ سے اٹھ کر معلوم نہیں کیسے گھر آیا۔ تھوڑی دیر میں صبح ہو گئی۔ صبح کی پہلی کرن ہر قسم کے ظاہری اور باطنی اندھیرے کی شدت کو کم کر دیتی ہے۔ میں جو کسی نامعلوم اداسی تلے دبا جا رہا تھا۔ پھر زندگی کی بھیڑ میں گم ہوتا گیا۔ مگر شاہ جی نے جس بجھے ہوئے لہجے میں یہ شعر پڑھا وہ میری رگوں میں یوں اتر گیا تھا کہ آج تک نکل نہیں سکا۔ کئی دن وقفے وقفے سے یہ شعر میری زبان پر بے ارادہ جاری ہوتا رہا۔ کبھی تحت اللفظ اور کبھی ترنم سے۔

انہیں کے مطلب کی بات کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات انکی
انہیں کی محفل سجا رہا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی